فکر و نظر............ اسلام آباد جلد: ۴۵ شمارہ: ۳

مقاصد شریعت: فہم و تطبیق

محمد نجات اللہ صدیقی☆

اس مقالہ کی ابتداء گزشتہ مباحث کی روشنی میں اس طریق و منہاج (methodology) کے بیان اور تلخیص سے کی جائے گی جن کے ذریعہ کسی نئی صورت حال میں یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کیا کرنا چاہئے۔ ذیل میں اس طریقہ کا خلاصہ درج ہے جو گزشتہ مباحث کے نتیجہ میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ اس تلخیص کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ لوگ کن اندیشوں کی بنا پر نئے پیش آ مدہ مسائل میں مقاصدِ شریعت پر مبنی اجتہاد سے جھجکتے ہیں، یا، کم از کم، عام مسلمانوں کو اس عملِ اجتہاد میں شریک نہیں کرنا چاہتے۔ ہم واضح کریں گے کہ یہ اندیشے درست نہیں۔ آخر میں مستقبل کی دنیا کے بارے میں کچھ اندازے پیش کرتے ہوئے یہ بتایا جائے گا کہ امّت کا بھلا اس میں ہے کہ نئے پیش آمدہ مسائل میں مقاصدِ شریعت پر مبنی اجتہاد کی ہمت افزائی کی جائے۔

گزشتہ مباحث نے ہمیں اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ:

مقاصد شریعت کی پہچان قرآن و سنّت کی روشنی میں عقل و فطرت کی مدد سے ممکن ہے۔ پیش آمدہ نئے حالات کا تجزیہ کر کے ان حالات کو سمجھا جا سکتا ہے۔

ان دونوں امور: مقاصد کے فہم اور حالات کے تجزیہ، میں اختلاف ہو سکتا ہے اور ہوتا رہا ہے۔

نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کا کوئی ایک لگا بندھا طریقہ نہیں۔ بعض اوقات ہم براہ راست نتیجہ تک پہنچ جاتے ہیں، یعنی اس بات کا ادراک ہو جاتا ہے کہ صحیح طرز عمل کیا ہو گا۔

ادراک حکم کے بعد، غور و فکر اور قلبی توجہ کے نتیجہ میں، اطمینان نفس اور فیصلہ کو قبول عام تک پہنچانے کے لئے عقل و نقل سے دلائل مہیّا کئے جا سکتے ہیں۔

اجتماعی امور میں، انفرادی ادراکات کو مشاورت کے عمل سے گزرنے کے بعد، فیصلہ یا حکم کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔

مقاصد شریعت کے پہچاننے، نئے حالات کا تجزیہ کرنے، ادراک حکم، اور مشاورت کے عمل میں

☆ مکان نمبر 4/1687-C، مزمل منزل کمپلکس، دودھ پور روڈ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲، بھارت

DMHE

مسلمان مرد اور عورت سب کو حصہ لینا چاہئے۔

بعض نئے مسائل میں دنیائے اسلام میں ایک سے زیادہ فیصلے ممکن ہیں، اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

ایک وقت کئے گئے فیصلے آگے چل کر، وقت گزرنے پر، تجربہ کی روشنی میں یا نئے دلائل کے پیش نظر، بدلے بھی جا سکتے ہیں۔

جن مسائل کا تعلّق صرف مسلمانوں سے نہیں بلکہ دوسرے انسانوں سے بھی ہو ان کے بارے میں فیصلہ کرنے میں ان کو بھی شریک مشورہ کرنا ہو گا۔

عام انسانی مسائل، خاص طور پر عالمی نوعیّت کے مسائل سے متعلق عالمی سطح پر مشاورت اور فیصلہ کے عمل میں مسلمانوں کو مقاصد شریعت کی روشنی میں فعال حصّہ لینا چاہئے۔

دعوت الی اللہ اور شہادت علی الناس، یعنی سارے انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچانا اور مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی عمل کو اس پیغام کا عملی مظہر بنانا، اہم ترین مقاصد میں سے ہے۔ اس مقصد کا تقاضا ہے کہ انسانی تعلّقات میں ایسا اسلوب اختیار کیا جائے جو جاذب توجہ ہو اور لوگوں کے دل و دماغ کو اسلام کے لئے سازگار بنائے۔

مذکورہ بالا مقصد کا تقاضا ہے کہ لوگوں کے دل و دماغ میں اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات، نفرت اور عداوت پیدا کر سکنے والے اسالیب سے احتراز کیا جائے۔

اجتہادی امور میں سب کو ایک رائے تک پہنچانے کی کوشش کی بجائے اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ لوگ فکر و عمل میں مختلف راہیں اختیار کرنے کے باوجود ایک دوسرے کے اختیار کا احترام کریں اور مل جل کر رہیں، نیز انسانیت عامہ سے خوش تعلقاتی اور تعاون میں ان اختلافات کو رکاوٹ نہ بننے دیں۔

گزشتہ سات مقالوں میں(ا) مندرجہ بالا نکات کے حق میں دلائل اور نظائر فراہم کئے جا چکے ہیں۔ ان کی تکرار کی بجائے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان خطرات اور اندیشوں پر گفتگو کی جائے جو اس طریقہ استدلال کو اختیار کرنے سے پیش آ سکتے ہیں۔ اس بات پر بھی غور کیا جائے گا کہ ہمارے سامنے اس طریقہ کا کوئی متبادل ہے یا نہیں؟ کیا فروع پر قیاس اور دیگر متوارِث فقہی طریقوں پر انحصار سے کام چل سکتا ہے؟ اس بات کی بھی نشاندہی کی جائے گی کہ مجوزہ طریقہ کوئی نیا راستہ نہیں

ہے بلکہ بعینہ وہی راستہ ہے جو صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور سلف صالحین نے اختیار کیا تھا۔ اس کے بعد یہ بتایا جائے گا کہ اس راستہ پر نہ چلنے کے نقصانات یقینی ہیں اور ان موہوم فائدوں سے بہت زیادہ ہیں جن کے حوالہ سے اس راستہ سے گریز کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔

انتشار و انحلال کے اندیشے

اس وقت نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لئے مسلمانوں کو علمائے دین کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ ہے۔ خاص طور پر جو لوگ فتویٰ دینے کے مجاز ہیں وہ مسلمانوں کو بتاتے ہیں کہ کیا کرنا چاہئے۔ جیسا کہ دوسرے مقالہ(۲) میں بتایا گیا تھا ملکی اور عالمی سطح پر ایسی مجالسِ فقہ قائم کی جا چکی ہیں جن میں منتخب علماء جمع ہو کر نئے پیش آمدہ مسائل پر غور و خوض اور بحث و مباحثہ کے بعد کوئی قرارداد منظور کرتے ہیں۔ حسبِ ضرورت، خاص طور پر طبّی اور اقتصادی مسائل میں، ماہرینِ فن کی آراء سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ عام مسلمانوں کے لئے ا جتہادی امور پر بحث و نظر کا دروازہ کھولنے کی بجائے اسی مروّجہ نظام پر اکتفاء مناسب ہے۔ عام لوگ قرآن و سنّت کا علم نہیں رکھتے وہ حالاتِ حاضرہ اور پیش آمدہ مسائل کی فنی تفصیلات سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ، ان پر دوسرے غیر اسلامی طور طریقوں کا اثر بھی نسبتہً زیادہ رہتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ جیسا کہ آخر کی صدیوں میں معمول رہا ہے، عام لوگوں کو نئے پیش آمدہ مسائل میں حکمِ شرعی کی تلاش کے عمل سے دور ہی رکھا جائے۔ اس طرح اس خطرہ کا دروازہ بھی بند ہو جائے گا کہ دشمن ہماری صفوں میں اپنے ایجنٹ چھوڑ کر یا ہمارے درمیان کسی خاص رائے کے حامل لوگوں کی سر پرستی کر کے، ہمارے دین کو بگاڑنے اور ہم کو اس سے منحرف کرنے کی کوشش میں کامیاب ہوسکے۔ جس طرح کے خطرات کے پیشِ نظر آخر کی صدیوں میں اجتہاد کا دروازہ بند کر کے عام مسلمانوں کو تقلید کا مشورہ دیا گیا تھا، اسی طرح کے خطرات اب نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کے عمل کو علماء و فقہاء اور ان پر مشتمل مجالس تک محدود رکھنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ ایسا کرنا اسی مقصد کے لئے ضروری ہے جس مقصد کے لئے سلف نے تقلید کا مشورہ دیا تھا، یعنی امت کو انتشارِ فکر و عمل سے بچانا۔ اگر انتشارِ فکر و عمل سے نہیں بچایا گیا تو انجامِ کار انحلال ہو گا، امت گمراہ ہو جائے گی، ٹکڑیوں میں بٹ جائے گی اور اس قابل نہ رہے گی کہ اپنا فرضِ منصبی ادا کر سکے۔

اگر نئے پیش آمدہ مسائل میں اختلافِ رائے باقی رہا، یا اس سے آگے بڑھ کر دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں میں مختلف آراء کے حق میں فیصلہ ہوا تو اسلام کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

بلکہ غور کیا جائے تو معاملات اور دیگر دنیوی امور میں تعدد آراء مستقبل کے اسلام کی قوت میں اضافہ کرے گا۔ رائے اور پالیسی کا تعدد مسابقت پیدا کرے گا۔ یہ داخلی مسابقت عالمی اسلامی امت کی توانائی میں اضافہ کرے گی اور اسے تازہ دم رکھے گی۔ ایک مرکز فیصلہ اور ایک مرکز قوت کا نہ ہونا اسے استبداد سے بچائے رکھے گا۔ وہ صورتِ حال نہیں پیدا ہو سکے گی جو بیسویں صدی میں کمیونسٹ نظام کے زوال و انحلال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

ہمارے خیال میں مسلمانوں میں مقاصدِ شریعت کی روشنی میں سوچ بچار اور نئے پیش آمدہ مسائل میں سب کی شراکت سے فیصلہ کے طریقہ کو رائج کرنے سے وابستہ یہ اندیشے مبالغہ آمیز اور غیرحقیقت پسندانہ ہیں۔ دوسری طرف یہ خیال بھی درست نہیں کہ تقلید کا جو مشورہ پہلے دیا گیا تھا وہ آج بھی دیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی سوچنا چاہئے کہ مسائل کی جو نوعیت آج ہے وہ ان مسائل سے کتنی مختلف ہے جو کچھ صدی پہلے سامنے آئے تھے مگر علماء اور فقہاء نے محدود پیمانہ پر اجتہاد کر کے ان کا مقابلہ کر لیا تھا۔ مزید برآں، جن نئے پیش آمدہ مسائل کا ذکر ہے ان کی غالب اکثریت کا تعلّق معاملات سے ہے نہ کہ عقائد یا عبادات سے۔ معاملات کی نوعیت اہلِ معاملہ ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ ان کو غور وفکر کے عمل سے دور رکھنا نقصان دہ ہو گا۔ نیز جیسا کہ ہم نے گزشتہ مقالہ(٣) میں بتایا تھا کہ آج کے بعض اہم مشترکہ انسانی مسائل ایسے ہیں جن پر نہ تو ماضی میں کبھی غور کی ضرورت پڑی کہ ہمارے دینی اور فقہی سرمایہ میں ان کا چرچا ملے نہ ان پر الگ سے صرف مسلمانوں کی فکری جدوجہد سے کوئی مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ ان پر غور و فکر میں ہر ملک و ملت کے لوگوں کی شرکت ضروری ہے۔ اسی طرح ان کے حل میں بھی سارے انسانوں کی شرکت درکار ہے۔ مذکورہ بالا موقف، یعنی عام مسلمانوں کو نئے پیش آمدہ مسائل میں حکمِ شرعی کی تلاش سے دور رکھنے کی رائے میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز کیا جا رہا ہے کہ حکمِ شرعی کے پہچاننے اور سمجھنے میں عقل و فطرت کا بھی حصہ ہے۔(٤)

انتشار و انحلال کے اندیشوں کے مبالغہ آمیز ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان میں امت مسلمہ کی اپنے دین سے وابستگی اور تمسک کو چند مسائل میں اختیار کردہ مسلک یا کسی رائے کے چھوڑنے یا اختیار کرنے پر منحصر سمجھ لیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امت ایمان بالغیب اور اس عقیدت اور جذباتی لگاؤ پر قائم ہے جو اسے محمد ﷺ اور ان کے اوّلین متبعین سے ہے۔ فقہی اختلافات اور زمانی اجتہادات کبھی امت مسلمہ کے وجود کے لئے خطرہ نہیں بنے۔ دوسری نظریاتی ملتوں کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ اختلافی امور پر کھلے عام تبادلہ خیالات اور فیصلوں میں جمہور کے حصہ لینے سے ملّتیں طاقتور ہوتی ہیں نہ کہ کمزور۔ حال کی تاریخ میں اس کی مثال مارکس اور اینجلز کے افکار پر مبنی

اشتراکی تحریک ہے۔ روس کے اندر کم اور روس کے باہر زیادہ کھلے مذاکرہ کا نتیجہ ہے کہ آج روسی تجربہ کی نا کامی کے باوجود اشتراکی تحریک زندہ ہے، نئے تجربوں کی تیاری ہے، چین کامیابی کی راہ پر گامزن ہے اور خود ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹیاں شریک حکومت ہیں۔ اس کے برعکس عبرت کی داستان عیسائی مذہب پیش کرتا ہے۔ عیسائیت نے نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے عمل میں عوام کو کبھی شریک نہیں کیا۔ انھوں نے اجتہادی امور میں فیصلوں کو گنے چنے ہاتھوں میں محدود کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیت کے متّبعین فرقوں میں بٹتے چلے گئے۔ وہ شخصی زندگی، اجتماعی زندگی، یا بین الاقوامی سطح پر متحدہ مسلک اختیار کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئے۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ فکری ہم آہنگی کا راستہ سوچ بچار پر قدغن اور فکری جکڑ بندی نہیں بلکہ آزادانہ فکر، تبادلہ افکار اور غور و بحث کا راستہ ہے۔ انتشار و انحلال سخت گیری اور جبر کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ نرم خوئی اور رواداری کا۔

مسلمانوں کے شایانِ شان یہ ہے کہ وہ بے بنیاد اندیشوں کے بجائے خود تاریخِ اسلامی کے عہدزرّین کو رہنما بنائیں۔ دوسری صدی ہجری کا بغداد اور اس کے کچھ بعد کا مدینہ، دمشق، کوفہ، قاہرہ اور غرناطہ ہمارے فکری سرمایہ اور فقہی ورثہ کا منبع ہیں۔ اس دور میں لاتعداد لوگ فہمِ قرآن، جمع حدیث، استنباطِ مسائل اور تزکیۂ نفس کے آداب مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ انہیں کسی حکمران نے اس کام پر مقرر نہیں کیا تھا، نہ معتقدین کے کسی حلقہ نے فکر معاش سے فارغ کر کے اس منصب تک پہنچایا تھا۔ ان کے حلقہ ہائے درس و تحقیق میں داخلہ کی کوئی فیس نہیں تھی، نہ ان کی تصانیف پر کوئی رائلٹی ملتی تھی۔ طالبِ علم علی الاعلان ایک استاد کی مجلس سے اٹھ کر دوسرے کی مجلس میں جا بیٹھتے اور استاد کی جبین پر شکن نہ آتی۔ کل کا تلمیذ آج خود شیخ بن کر اپنا حلقہ درس قائم کر لیتا، کوئی نکیر نہ کرتا۔ دوسری سے چھٹی صدی ہجری تک درجنوں مذاہبِ فقہ اور مکاتب فکر ابھرے مگر امت کے انتخاب اور تعامل نے آنے والی نسلوں کے لئے کچھ کو محفوظ رکھا باقی تاریخ کی زینت بنے۔ آج بھی یہی داستان دہرانے سے ڈرنا کیوں؟

مسئلہ پر ایک اور زاویہ سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا صرف سد بابِ فتنہ کی خاطر، یعنی انتشار کے ڈر سے، مسلمان عوام کو کسی ایسے عمل سے روکا جا سکتا ہے جس کے وہ منجانب اللہ مکلّف ہوں؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام چاہتا ہے کہ ہر فرد قرآن کو براہِ راست پڑھے اور ساتھ ہی اپنے ارد گرد کی دنیا کو بھی خود سمجھنے کی کوشش کرے پھر اس دنیا میں ہدایاتِ الٰہی کے مطابق زندگی گزارے۔ ایسا کرنے میں نبی ﷺ کا اسوہ اس کی رہنمائی کرے گا۔ اس کام میں دوسرے انسانوں کی مدد تو لینا چاہئے، مگر قرآن و سنت کے مطالعہ، آیاتِ کائنات پر غور، اور مسائلِ حیات کو سمجھنے کی کوشش

سے مومن کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جب خدا نے خود انسانوں کو اپنا کلام پڑھنے اور سمجھنے کی دعوت دی ہے تو ہم کون ہوتے ہیں جو ان کو اس کے لئے نااہل disqualified قرار دے دیں؟ خدا اپنے بندوں کی صلاحیتوں سے زیادہ واقف ہے، اسی نے انہیں بنایا ہے! اس سلسلہ کی چند آیات کا مطالعہ مفید رہے گا:

اقرأ باسمِ ربّک الّذی خلق (۵)

پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔

قل، انّما اعظکم بواحدةٍ، ان تقوموا للّٰہ مثنیٰ و فرادیٰ، ثمّ تتفکّروا(۶)

ان سے کہو! میں تمھیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، خدا کے لئے تم اکیلے اکیلے اور دو دو کر کے اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو......

کتٰبٌ انزلنٰہ الیک مبارکٌ لیدبّروا اٰیٰتہٖ ولیتذکّر اولوا الالباب.(۷)

یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔

ھٰذا بصائر للنّاس و ھدیً و رحمةٌ لقومٍ یوقنون.(۸)

یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں سب لوگوں کے لئے اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لئے جو یقین لائیں۔

....و انزلنا الیک الذکر لتبیّن للناسِ ما نزّل الیھم و لعلّھم یتفکّرون(۹)

...... اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا گیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لئے اتاری گئی ہے، اور تاکہ لوگ (خود بھی) غور و فکر کریں۔

و ھو الّذی انشأکم من نفسٍ واحدةٍ فمستقرٌ وّ مستودع، قد فصّلنا الاٰیٰتِ لقومٍ یفقھون.(۱۰)

اور وہی ہے جس نے ایک جان سے تم کو پیدا کیا پھر ہر ایک کے لئے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ۔ یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

او لم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰتِ والارض، وما خلق اللّٰہ من شیءٍ و ان عسیٰ ان یکون قد اقترب اجلھم.(۱۱)

کیا ان لوگوں نے زمین اور آسمان کے نظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی جو خدا نے پیدا کی ہیں آنکھ کھول کر نہیں دیکھا؟ اور کیا یہ بھی انھوں نے نہیں سوچا کہ شائد ان کی مہلتِ زندگی پوری ہونے کا وقت قریب آ لگا ہو؟......

الّذین اٰتینٰھم الکتٰب یتلونہٗ حقَّ تلاوتہِ.(۱۲)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے......

کذالک یبیّن اللہ لکم اٰیتہِ لعلّکم تعقلون.(۱۳)

اسی طرح اللہ اپنی آیات کی تمھارے لئے وضا حت کرتا ہے تا کہ تم سمجھو۔

نبیﷺ نے خبر دی ہے کہ قرآن فہمی کے لئے اجتماعی مطالعہ میں بڑی برکت ہے:

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: جو علم کی تلاش میں راستہ طے کرے اللہ اس کے لئے جنت کی راہ ہموار کرے گا اور جب بھی کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر اللہ کی کتاب پڑھیں اور اس کو باہم ایک دوسرے کو سمجھائیں، تو ان پر سکینت نازل ہوگی، ان کو رحمت ڈھانپ لے گی، فرشتے ان کے چاروں طرف جمع ہوں گے اور اللہ ان کا ذکر اپنے حضور موجودین سے کرے گا(۱۴)۔

بلا شبہ عربی زبان نہ جاننے والوں کے لئے قرآن فہمی ایک کوشش کی طالب ہے۔ مگر اللہ کے فضل سے آج ہر زبان میں قرآن کریم کے متعدد تراجم موجود ہیں۔ آج سے ڈھائی سو سال پہلے جب ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے تجدید و احیاء دین کا بیڑا اٹھایا تو صورتِ حال مختلف تھی۔ مگر ان کی نگاہِ بصیرت افروز نے بھانپ لیا کہ عام مسلمان کو کلامِ الٰہی سے مربوط کئے بغیر حقیقی دین داری نہیں پیدا ہو گی۔ چنانچہ انھوں نے اس وقت کی عوامی زبان، فارسی، میں ترجمہ کیا جس کا نام **فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن**، رکھا۔ اس کتاب کے مقدمہ میں شاہ صاحب لکھتے ہیں: 'یہ کتاب بچپن ہی میں پڑھا دینی چاہئے تا کہ سب سے پہلے ان کے ذہن میں جو چیز آئے وہ اللہ کی کتاب اور اس کے مطالب ہوں'(۱۵)۔ ان سے شاہ صاحب کی مراد عام دلّی والے تھے جو تھوڑی تعلیم کے بعد مغل فوج میں بھرتی ہو جاتے یا کسی نواب کی ڈیوڑھی سنبھالتے۔ انھوں نے ٹھیک ہی سوچا۔ آخر جب قرآن نازل ہوا تو اونٹ بکریاں چرانے والوں نے بھی اسے سمجھا۔ کوئی وجہ نہیں آج کے نسبت زیادہ ہوشیار عوام کو اس سے استفادہ میں مشکل پیش آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک عملی روزمرہ

زندگی کا تعلق ہے، قرآن کی تعلیمات بڑی عام فہم ہیں۔ وراثت کا قانون اور نکاح و طلاق جیسے مسائل تو گنی چنی آیات میں آئے، قرآن کا بیشتر بیان عام فہم اخلاقی ہدایات اور امورِ غیب کی سادہ تفہیم پر مشتمل ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی تقریریں عام مسلمانوں تک یہ باتیں زیادہ آ سانی سے پہنچا کر ان کو قرآن کی طرف براہِ راست رجوع سے مستغنی کر سکتی ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ خدا کے کلام کا اثر انسان کی تقریر میں نہیں پیدا ہو سکتا۔

ایک دوسری بھول جو ہمارے تجویز کردہ طریقہ سے مبالغہ آمیز اندیشے وابستہ کرنے والوں سے ہوتی ہے وہ تمام نئے پیش آمدہ مسائل کو، جن پر غور و بحث میں ہم عام مسلمانوں کو شریک کرنے کی دعوت دے رہے ہیں، فقہی اجتہاد بمعنی معروف کے مرادف سمجھ لینا ہے۔ واقعہ یوں نہیں ہے۔ نئے پیش آمدہ مسائل کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے۔ ان میں تعلیم، حفظانِ صحت، تفریح، سیروسیاحت، پڑوسیوں سے میل جول، بچوں کی تربیت، میاں بیوی کے تعلقات، دعوت الی اللہ، کارکنوں کی تربیت، جماعتوں کی تنظیم، ان کے مالیات، ملکی نظام سے تعامل اور اس میں حصہ داری، دوسری اقوام و ملل سے تعامل interaction، بین الاقوامی تعلقات انفرادی، گروہی، ملّی اور ملکی سطحوں پر وغیرہ لا تعداد امور شامل ہیں۔ ان میں سے بہت سے عنوانات متوارث فقہ کے دائرہ میں نہیں آتے۔ مگر اجتہاد کی ضرورت ان دائروں میں بھی ہے۔ شریعت کسی ٹھہرے ہوئے سماج کو اوامر و نواہی کی ایک متعین اور محدود فہرست کا پابند بنانے والا ضا بطہ نہیں ہے بلکہ ایک مقصد کی طرف بڑھتے ہوئے انسانی گروہ کی اخلاقی بنیادوں پر تنظیم کرنے والا مجموعہِ احکام ہے جو اس مقصد کا آئینہ دار اور اس کے حصول میں مدد گار ہو۔ مقاصدِ شریعت پر مبنی اجتہاد کا مقصود فرد و اجتماع کی نسبت سے مقاصدِ شریعت کی تحصیل و تکمیل ہے۔ چوں کہ مقاصد شریعت دینی اور دنیوی دونوں طرح کے امور کو محیط ہیں، اس لئے اجتہادی عمل دینی اور دنیوی دونوں طرح کے امور میں مطلوب ہے۔ مگر عملی زندگی میں دینی اور دنیوی کی تقسیم سیاہ و سفید کی طرح واضح نہیں ہو سکتی۔ اکثر اوقات دونوں ملے جلے ہوتے ہیں جیسا کہ تعلیم اور صحت و علاج کے دائروں پر تفصیلی غور سے سمجھا جا سکتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ اگر مسلمان عوام کو تقلیدِ محض کی تعلیم دی گئی اور مشاہدات و تجربات پر مبنی غور و فکر کی ہمت شکنی کی گئی تو اس کا اثر دینی امور تک محدود نہیں رہے گا۔ وہ دنیوی امور میں بھی ایجاد و اختراع، ابداع اور جدید کاری سے محروم رہ کر ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ زندگی ایک اکائی ہے، اس میں دوئی ممکن نہیں۔ لوگ دینی معاملات میں مقلدِ محض بن کر رہیں لیکن دنیوی امور میں نئے نئے راستے نکالیں، ایسا ہونا مشکل ہے۔ ذہن بیدار ہو گا، نئے سوالات اٹھائے گا، مروّجہ طریقوں پر نظرِ ثانی کرنا چاہے گا تو اس کی جولاں گاہ پوری

زندگی ہو گی۔ امت کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے۔ ابتدائی چار صدیوں میں مسلمانوں نے دنیا میں بھی ترقی کی اور دین میں بھی، جس کا زندہ ثبوت ہمارے دینی علوم کا ذخیرہ ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا، یہی وہ دور تھا جس میں غور وفکر اور تبادلۂ آراء بے روک ٹوک جاری تھا اور سارے مسلمان اس عمل میں شریک تھے۔

کیا سابقہ صورتِ حال کا تسلسل ممکن ہے؟

ہم اگر چاہیں بھی تو سابقہ صورتِ حال status quo برقرار نہیں رہ سکتی۔ اس کی متعدد وجوہ ہیں جن میں سے چند کا ذکر مناسب ہو گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں، گزشتہ چند برسوں میں، معروف فقہی دائرہ میں بھی، استفتاء اور افتاء کے متوارث نظام کی کمزوریاں سامنے آ کر اسلامیانِ ہند کی خفت کا سبب بن چکی ہیں۔ مصر میں عورتوں کے ختنہ کا مسئلہ اور اس میں مفتی حضرات اور ازہر کا اختلاف، عالمی پریس میں شہ سرخیاں بن چکا ہے۔ نائجیریا میں امینہ لاوال کا معاملہ اور پاکستان میں مختاراں مائی کا مسئلہ (۱۶) بھی فتویٰ کی موجودہ طرز کو بد نام کر گیا۔ آپ مسلمان عوام کی زبان بندی کر سکتے ہیں مگر قومی اور عالمی میڈیا کو تو خاموش نہیں کر سکتے۔ پھر جب بات میڈیا میں اچھلے تو مفتیانِ کرام سے کام نہیں چلتا، اسلام کے دفاع کے لئے مسلم دانشوروں اور صحافیوں کی خدمات درکار ہوتی ہیں۔ ہم انھیں نئے پیش آمدہ مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور وفکر کے عمل سے بے دخل رکھ کر وقت آنے پر ان سے شریعت کی وکالت کی توقع کیسے کر سکتے ہیں؟ مناسب یہی ہے کہ سابقہ طریقہ کی جگہ کوئی نیا طریقہ سوچ سمجھ کر اختیار کیا جائے، یہ نہیں کہ وقت گزر جائے اور ہم کوئی قدم نہ اُٹھا پائیں۔

دوسرا سبب جو سابقہ صورتِ حال کے تسلسل میں مانع ہے وہ نئے پیش آمدہ مسائل کی نوعیت ہے۔ جیسا کہ ہم نے ایک سابقہ مقالہ میں معاصر اسلامی فنانس کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے(۱۷)، اس مخصوص میدان میں عام مفتیانِ کرام سے کام نہیں چلا تو نئے مالیاتی طریقوں کی شرعی توثیق Shariah Certification کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا گیا جس کی کوئی نظیر ماضی کی اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اب اس طریقہ کی محدودیت کا شعور ابھرا ہے، جیسا کہ ہم نے تورّق کی بحث میں واضح کیا ہے(۱۸)۔ نئے غور وفکر کا سلسلہ جاری ہے، ان شاء اللہ کوئی راہ نکلے گی۔ یہاں اس کا ذکر اس مناسبت سے آیا کہ ایسی صورتِ حال جو فنانس کے میدان میں پیدا ہوئی کل دوسرے میدانوں میں بھی سامنے آ سکتی ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کی تیاری کرنا ضروری ہے۔ تعلیم ہی کے مسئلہ کو لیجئے۔

آج کے مابعد الصنعت post-industrial، علم پر مبنی knowledge-based سماج میں ہمارے بعض علماء دینی درس گاہوں میں عصری تعلیم کی ضرورت سے انکار کے لئے وہی دلیلیں دے رہے ہیں جو سو ڈیڑھ سو سال پہلے دی جاتی تھیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جدید تعلیم کا فائدہ یہ ہے کہ نوکری ملنے میں آسانی ہوتی ہے۔ انھیں اس بات کا لحاظ نہیں کہ اس عرصہ میں دنیا بدل گئی۔ عصری تعلیم اب صرف ذریعۂ معاش نہیں۔ عصری تعلیم آج اپنے ماحول کو خود اپنے کو نیز انسان اور اس کے ماحول اور انسان اور انسان کے باہمی ربط کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ مدارس میں عصری تعلیم اس لئے درکار ہے کہ دینی تعلیم میں اختصاص رکھنے والے یہ جان سکیں کہ ان تعلیمات کی تطبیق کن پر ہونی ہے، کن حالات میں ہونی ہے۔ اگر تعلیم کے مسئلہ میں فیصلہ کرنے کے عمل میں ہر اختصاص کے لوگوں کو شریک رکھا جاتا تو ایسی بھول نہ ہوتی جیسی سینکڑوں سال سے عصری تعلیم کو مدارس سے باہر رکھ کر ہو رہی ہے۔

ایک اہم بات جس کا ذکر کرکے ہم آگے بڑھیں گے ملت اسلامیہ کے مشن، دعوت الی اللہ اور شہادتِ حق سے متعلق ہے۔ آخر کی صدیوں میں تقلید کا حصار ایک دفاعی تدبیر کے طور پر کھینچا گیا تھا۔ کوئی نہیں کہتا کہ یہ عام انسانوں تک اسلام کی تبلیغ اور ان کے سامنے اسلامی زندگی کا نمونہ بن کر آنے کی تدبیر تھی۔ تقلید امت کا ایک داخلی بندوبست تھا، اس کا امت کے اس خارجی مشن سے کوئی واسطہ نہیں جس کا ذکر ذیل کی آیت کریمہ میں آیا ہے۔

> **کنتم خیر امّةٍ اخرجت للنّاس.(۱۹)**
>
> وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے......

اس خارجی مشن کی انجام دہی کے تقاضے بہت وسیع ہیں۔ تقلید کی پرانی روش آج کی دنیا میں اس مشن کی انجام دہی میں مددگار نہیں ہوتی بلکہ رکاوٹ بنتی ہے۔

اوپر ہم نے نوٹ کیا کہ آخر کی چند صدیوں میں تقلید کا طریقہ اسلامی معاشرہ پر اجنبی (مغربی) قوموں کی یلغار کے زمانہ میں ایک دفاعی تدبیر کے طور پر جاری رکھا گیا۔ مگر تقلید کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ پانچویں چھٹی ہجری ہی سے یہ طریقہ زور پکڑ گیا تھا۔ مگر اس وقت بھی اس کی حیثیت ایک دفاعی تدبیر کی تھی۔ علماء اور فقہاء نے جب یہ دیکھا کہ ان کے (مسلمان) حکمرا ن سیاسی مصالح اور اپنے اقتدار کے مفاد میں 'اجتہادٗ کرنا یا کرانا چاہتے ہیں، تو انھوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ اب اجتہاد کا

دروازہ بند ہو چکا ہے(۲۰)۔ ہم جس آنے والے دور کی بات کر رہے ہیں، جس کی چند خصوصیات کا آ گے ذکر آئے گا، وہ مختلف ہو گا۔ نہ تو اجنبی یلغار کا خطرہ سرِ فہرست ہو گا نہ غیر شورائی، مطلق العنان، 'مسلمان' حکمرانوں کا دور دورہ باقی رہے گا۔ وہ ایک مختلف ماحول ہو گا جس میں ہر مسلمان کو اسلام کی ترجمانی کا بیڑا اٹھانا ہو گا۔ جس میں اس کا موقع ہو گا کہ اصحاب اختصاص اور عام لوگوں کے اپنے اپنے دائروں کی پوری رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے، پورا مسلم سماج اسلام کو سمجھنے اور اس پر عمل کر دکھانے کے کام میں فعال حصہ لے سکے۔ ہر مسلمان کو پیش آمدہ مسائل کے حل میں حصہ لینے کی دعوت کوئی نئی بات نہیں۔ خود نبی ﷺ کے ارشاد میں یہ دعوت عام مضمر ہے۔

......جریر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے بھی اسلام میں کسی اچھے طریقہ کا آغاز کیا تو اسے ایسا کرنے کا اجر ملے گا اور اسے ان دوسرے لوگوں کے عمل کا بھی اجر ملے گا جو اس کے بعد اس طریقہ کو اختیار کریں، بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے اجر میں کوئی کمی کی جائے۔(۲۱)

نئے پیش آمدہ حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نئے طریقے اختیار کرنے کا سلسلہ اسلامی سماج میں روزِ اوّل سے جاری رہا۔ صحابۂ کرام، تابعین اور تبع تابعین، ان تینوں مبا رک ادوار میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ تفصیلا ت میں جائے بغیر صرف چند کا ذکر کیا جائے گا۔

قرآنِ کریم کے مستند نسخہ کی تیاری اور تمام اسلامی علاقوں میں اُس کی نقلیں بھیج کر غیر مستند نسخوں کو واپس منگوانا اور تلف کر دینا، ایک عظیم تاریخی اقدام تھا۔ بے شک نبی ﷺ نے قرآن کریم کو لکھا ہوا اور لوگوں کو حفظ کیا ہوا، مکمل اور محفوظ چھوڑا تھا۔ مگر دور دراز تک پھیلے اسلامی علاقوں میں اسی مستند نسخہ کی نقلیں پہنچانا، یہ کام نہ تو نبی ﷺ کی زندگی میں ممکن تھا (کیوں کہ نزولِ قرآن کا سلسلہ جاری تھا) نہ عملاً ہوا۔ اس سلسلہ کا پہلا قدم، یعنی نبی ﷺ کے چھوڑے مواد کے مطابق جمع و ترتیب قرآن، پہلے خلیفہ، حضرتِ ابوبکرؓ کی ایماء پر اٹھایا گیا۔ اس کی تکمیل، یعنی متعدد مستند نسخوں کی تیاری اور ان کو ہر طرف بھیج کر غیر مستند نسخوں کی بازیافت حضرت عثمانؓ کی زیر نگرانی انجام پایا۔ سارا کام صحابہ کے مشورہ سے کیا گیا۔ ایسا کرنے کا صریح حکم نہ قرآن میں تھا نہ حدیث میں۔(۲۲)

عہدِ نبویؐ میں حدیث کی تدوین سے گریز کیا گیا تاکہ خدا کا کلام محفوظ رہے۔ یہ کام تابعین اور تبع تابعین کے دور میں زور شور سے شروع ہوا۔ اس عرصہ میں وہ لوگ دور دراز تک پھیل گئے تھے جنھوں نے نبی ﷺ سے، یا ان سے جنھوں نے آپ کو سنا یا دیکھا تھا، حدیث سنی تھی۔ چنانچہ

احادیثِ نبی ﷺ کی تدوین کا سلسلہ ڈھائی، تین سو سال تک جاری رہا۔ اس کام کو آزادانہ کام کرنے والے علماء اور محققین نے انجام دیا۔ کسی پر پابندی نہ تھی کہ وہ اس کام میں حصہ نہ لے، کسی پر جبر نہ تھا کہ وہ اس کام میں ضرور ہاتھ لگائے۔ تاریخِ عالم کی اس عدیم المثال علمی تحریک میں لاکھوں افراد، مرد اور عورت، نے اپنے طور پر حصہ لیا۔ اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔(۲۳)

جدید حالات، بالخصوص نقل و حمل اور مواصلات کی سہولتوں نے دنیا کو ایک کر دیا ہے۔ مسلمان دوسروں کے ساتھ رہ رہے ہیں، ان سے ہم کلام ہیں، انھیں ان کے اعتراضات کا جواب بھی دینا ہے اور حسبِ موقع اسلام کی اچھی تصویر بھی سامنے لانی ہے۔ مزید برآں، جیسا کہ گزشتہ مقالہ، 'مقاصدِ شریعت اور مستقبلِ انسانیت' میں بتایا گیا، بہت سے نئے مشترکہ انسانی مسائل کے حل میں انھیں دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنا ہے۔ ان کاموں کو صرف وہ لوگ انجام نہیں دے سکتے جنھوں نے صرف دینی مدارس میں تعلیم پائی ہو، نہ یہ شریعہ سکالرز کی اس نئی کھیپ کے بس کی بات ہے جو اسلامی فنانس کے طفیل پروان چڑھی ہے۔ اس میں ہر میدان کے تجربہ کار، ہر فن کے متخصصین، مردوں اور عورتوں، سب کے لئے کردار ادا کرنے کے کچھ کام ہیں۔ سارے انسانوں سے تعامل interaction کے لئے ساری امت کا متحرک ہو جانا mobilization ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک کا کردار یکساں نہیں ہو گا۔ شرعی علوم میں اختصاص رکھنے والوں کی امتیازی کارکردگی سے بھی انکار نہیں۔ مگر ان پر انحصار ممکن نہیں۔ اسلام کی نمائندگی ہر موقع اور ہر میدانِ حیات میں اسی صورت ممکن ہے جب ہر مسلمان میں اپنے اوپر اتنا اعتماد پایا جائے کہ وہ اسلام کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ کارِ دعوت میں اختصاص پیدا کرنے والوں کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں، مگر عامۃ الناس کو دعوت اسلام کی ترجمانی کو ایک محدود طبقہ میں محصور کر کے ممکن نہیں۔

ایک نئے مستقبل کے لئے تیاری

آج سے پچاس، پچھتّر سال بعد کی دنیا اس سے بہت مختلف ہوگی جو آج سے پچاس، پچھتّر سال پہلے، اس زمانہ میں تھی جب موجودہ اسلامی تحریکوں کی داغ بیل پڑی تھی۔ آنے والے حالات کی تین خصوصیات خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ پہلی یہ کہ اُس دنیا میں امریکہ اور اس کے مغربی حلیفوں کی چودھراہٹ ختم ہو چکی ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی امریکہ کے پاس اسلحوں کے اسٹاک سب سے زیادہ ہوں (جیسا کہ سویٹ یونین کے انحلال کے فوراً بعد روس کا حال تھا) مگر اقتصادی طور پر وہ دوسرے یا تیسرے مقام پر پہنچ چکے ہونے کے سبب کسی فیصلہ کن عالمی رول کے قابل نہ رہ جائے

گا۔ دوسری خصوصیت آنے والی دنیا کی یہ ہو گی کہ امریکی تسلط کے خاتمہ کے ساتھ عالمِ اسلامی سے فوجی حکمرانوں، ڈکٹیٹروں اور پشتینی بادشاہوں کا بوریا بستر بھی بندھ چکا ہو گا۔ مراکش سے خلیج تک جو نئ حکومتیں بنیں گی، ان کے بارہ میں بجا طور پر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے عوام کے اسلامی رجحانات کی آئینہ دار ہوں گی۔ تیسری اہم خصوصیت بساطِ عالم پر چین اور ہندوستان کی معیشتوں کی بالادستی ہو گی۔ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ نئ سپرپاور اُس استکبار arrogance سے کس حد تک بچی رہ سکیں گی جو تاریخِ عالم میں اکثر بڑی طاقتوں کا وطیرہ رہا ہے۔ حال کے زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کی نسبت سے ان کا رویّہ کچھ حوصلہ افزا نہیں رہا ہے۔ اس کے باوجود امرِ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں کی تاریخ اس گہری اسلام دشمنی اور مسلمان دشمنی سے نسبتًہ پاک رہی ہے جو مغرب کی عیسائی قوموں نے صلیبی جنگوں سے ورثہ میں پا ئی ہے۔ دونوں ملکوں میں قدیم سے معتدبہ اسلامی اقلیت کی موجودگی کا وزن بھی رائگاں نہیں جا سکتا۔ یہی نہیں، بلکہ اگر دونوں طرف سے ہوش مندی کا مظاہرہ ہوا، اور چین اور ہندوستان کی مسلمان اقلیتوں اور ان ملکوں کی عام آبادیوں، نیز حکومتوں کے درمیان خوش تعلقاتی رہی، تو چین و ہند اور عالمِ اسلامی کے درمیان خوش تعلقاتی اور تعاون پوری انسانیت کے کے لئے رحمت اور برکت ثابت ہو سکتا ہے۔

بڑی کوتاہی ہو گی اگر آنے والے حالات سے مقابلہ کی تیاری ان مفروضات پر مبنی ہو جن پر گزشتہ صدی کی دوسری، تیسری دہائیوں میں ابھرنے والی اسلامی تحریکات مبنی تھیں: اسلام پر مغرب کی یلغار کا دفاع اور اسلام سے مسلمانوں کے جذباتی لگاؤ کے سہارے نو آزاد مسلم قومی حکومتوں کو اسلامی حکومتوں میں بدلنے کا حوصلہ۔ بیسویں صدی میں مدافعت کا سماں رہا، آنے والا زمانہ مسابقت کا ہے۔ گزرے ہوئے زمانہ کا لہجہ، اس کی ترجیحات، آنے والے زمانہ کی اسلامی تحریک کے لئے سازگار نہیں ہوں گی۔ نئ سوچ کی ضرورت ہے۔ یہ مسابقت صرف اقتصادی نہ ہو گی، نہ اس کا دائرہ صرف علوم و فنون تک محدود رہے گا۔ اصل مسابقت افکار و اقدار کے میدان میں ہونے والی ہے۔ بازی وہ نظامِ فکر وعمل لے جائے گا جو فردِ انسانی کو دوسرے انسانی افراد یا گروہو ں کا محکوم بنائے بغیر ان کے دنیوی حوصلے پورے کرنے کا وعدہ کرے اور ساتھ ہی غیبی امور سے متعلق ان کے سوالات کے ایسے جواب دے جو دل میں اتر جائیں۔ جدید انسان نے بڑی مشکل سے ان لوگوں کی چودھراہٹ سے چھٹکارا حاصل کیا تھا جو خدا کے ترجمان بن کر اس کے بندوں پر حکمرانی کا حق جتاتے تھے۔ امورِغیب میں حیرانی اسے اب بھی ہے اور وہ تلاش بھی پائی جاتی ہے جو حیرانی کا لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن یہ تلاش وہ اپنی عقل کی رہنمائی میں کرنا چاہتا ہے نہ کہ اس سے دستبردار ہو کر۔ اسی طرح اسے

اخلاق کی ضرورت کا بھی اعتراف ہے، مگر وہ یہ نہیں چاہتا کہ لوگوں کو با اخلاق بنانے کے نام پر کچھ لوگ دوسرے لوگوں پر قہر ڈھائیں۔ دلوں کو جیت لینے والے عملی نمونے واضح افکار اور صاف ستھرے اقدار کی جلو میں ہی نمودار ہو سکتے ہیں۔ مسلمان علماء اور دانشوروں کا پہلا ہدف جدید انسان کے اندیشوں کو دور کرتے ہوئے اسلام کی ایسی فکری ترجمانی کو ہونا چاہئے جو ایک ایسی متوازن زندگی کی بشارت دے سکے جو حریت اور راست روی دونوں کی ضامن ہو۔ مگر اس ہدف کی طرف پیش قدمی کی پہلی شرط یہ ہے کہ امت نہ تو صرف اپنے داخلی مسائل میں الجھی رہے نہ خارج پر اس کی نظر تمام تر خوف اور اندیشہ پر مبنی ہو۔

ماضی قریب کی اسلامی تحریکیں ایسے زمانہ میں ابھریں جب دنیا کی بیشتر مسلم آبادیاں اجنبی اقتدار کے تحت تھیں۔ ان کی محکومیت سے نجات حاصل کرنا اور اسلامی حکمرانی کا قیام ان کی اوّلین ترجیح بنی۔ اب صورتِ حال بدل چکی ہے، ظاہری طور پر سب کو سیاسی آزادی مل چکی، اگرچہ حکمرانی کو اسلامی بنانے میں کامیابی کا درجہ مختلف مسلمان ملکوں میں مختلف، بلکہ بعض حالات میں بمنزلۂ صفر ہے۔ آج معاشی ترقی کی دوڑ ہے، کل کو ترقی بھی حاصل ہو چکی ہو گی۔ مگر جو چیز دور دور تک نہیں ہوتی نظر آتی وہ اس عدل کا قیام ہے جسے بعثتِ انبیاء کا مقصود بتایا گیا ہے۔ جس مستقبل کے لئے ہم امت کو تیاری کرنے کی دعوت دے رہے ہیں اس میں اسلامی کام کی ترجیحِ اوّل قیامِ عدل و قسط کو حاصل ہو گی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس بدلتی دنیا میں سارے انسانوں کے لئے عدل و قسط کا نقشہ کیا متوارَث فقہی جزئیات پر قیاس سے بن سکتا ہے؟

قیامِ عدل و قسط کے تقاضے

عدل کیا ہے؟ قسط کیوں کر بروئے کار آئے؟ ان سوالوں کا جواب حالاتِ زمانہ سے بے نیاز ہو کر نہیں دیا جا سکتا۔ اس جواب کی تفصیلات ہر ملک، ہر قوم کے لئے یکساں نہیں ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ جو جوابات اسلام کی ابتدائی صدیوں میں دیے گئے ان سے کچھ رہنمائی تو ضرور حاصل ہو سکے گی لیکن وہ نہ تو ہر حالت میں قابلِ نفاذ ہوں گے نہ تمام حالات کا احاطہ کر سکیں گے۔ خاص طور پر اقتصادی میدان میں، مگر بالعموم دیگر سماجی امور میں بھی، پہلے اس فساد کو پہچاننا ہو گا جو آج پایا جاتا ہے۔ پھر ان اسباب تک پہنچنا ہو گا جو فساد برپا کرنے کا سبب بنے۔ اس کے بعد اس حالت state of the world کا تصور کرنا ہو گا جو مطلوب ہے۔ اس کے بعد ہی اصلاحِ عالم کا نیا اسلامی ایجنڈا مرتب ہو سکے گا۔ اگر غور کیا جائے تو یہ کام بعینہٖ وہ کام نہیں ہے جس کے لئے قدماء نے اجتہاد کی

بڑی بڑی شرطیں بتا رکھی ہیں۔ اس کام کے کچھ عناصر اگر قدیم فقہی اجتہاد سے ملتے جلتے ہیں تو دوسرے عناصر ایسے ہیں جن سے ملتے جلتے کاموں کو قدیم میں سیاسۃ شرعیہ، یا کبھی کبھی، تدبیر الملوک کا نام دیا گیا تھا۔ گزشتہ برسوں میں اسی کام کے بعض دوسرے عناصر کو فقہ الدعوہ کا نام دیا گیا۔ اس کام کے مجموعی تصور کو قرآنی اصطلاح تزکیہ سے بھی مناسبت ہے۔ مگر ان قدیم اور اضافی تصورات concepts کی گرفت ان نئے زمینی حقائق کے احاطہ سے عاجز ہے جن سے آج سابقہ ہے۔ اس نئے کام میں یہ سب کام شامل ہیں اور کچھ اور بھی جسے ہم کام کے دوران سمجھ سکیں گے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ پچھلی دو صدیوں سے، جب سے دنیا نسبتاً تیزی سے بدلی، امت کے علماء، فقہاء اور دانش وروں نے نئے حالات کی نسبت سے ان سوالات کے جوابات دینے کی کوئی قابل لحاظ کوشش نہیں کی۔ عدل کیا ہے؟ قسط کیسے بروئے کار آئے؟ ان سوالات پر مابعدالصنعتی سماج اور معلوماتی انقلاب information revolution کو سامنے رکھ کر تفصیلی طور پر نہیں سوچا گیا۔ سماجی، سیاسی اور اقتصادی میدان ہائے حیات میں آج عدل کے تقاضے کیا ہیں، کیسے پورے کئے جا سکیں گے یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ مگر افسوس کہ گزشتہ صدی کی اسلامی تحریکوں نے بھی اس کی اہمیت اور ضرورت کو نہیں سمجھا۔

اس کمی کا ایک ناپسندیدہ نتیجہ یہ رہا کہ گزشتہ صدی میں جہاں جہاں اسلام کو حکمران بنانے کے نئے مواقع ملے وہاں کے تجربے نہ اپنوں کو بھا سکے نہ غیروں کو لُبھا سکے۔ پاکستان، ایران، سوڈان، افغانستان...... کے اسلامی مظاہروں نے دنیا کو اسلام کی طرف متوجہ ضرور کیا مگر اسلام سے قریب کرنے میں کوئی مدد نہیں کی۔ جدید حالات میں قیامِ عدل کے لئے ضروری تھا کہ ان حالات کا تجزیہ کرنے اور ان حالات کی مناسبت سے قیامِ عدل کا ایجنڈا مرتب کرنے کے کام میں ہر اختصاص کے مسلمان علماء اور دانش وروں کو شریک کیا جاتا۔ مگر ایسا نہیں کیا جا سکا۔ الاّ ماشاء اللہ، قدیم تصورات اور تفصیلات کا سہارا لیا گیا اور نئی نزاکتوں کی رعایت نہ ملحوظ رکھی جا سکی۔ مقاصدِ شریعت، مصالحِ امت اور فلاحِ انسانیت کو سامنے رکھ کر اجتہاد کی بجائے فقہی اجتہاد بمعنی معروف کا راستہ اختیا کیا گیا جو زیادہ تر فروع و قیاس پر مشتمل تھا، جس کے بعد مسلکی اختلاف اور مذاہب فقہ کی تقلید خود بخود آ گئی۔

مثالیں اکثر بات کو سمجھانے میں مددگار ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی ان کی وجہ سے نئی اختلافی بحثیں بھی کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اس خطرہ کے باوجود اوپر کی بات ایک مثال کے ذریعہ واضح کی جائے گی۔

سیاسی اور معاشرتی دائرہ میں بھی مثالیں ممکن ہیں لیکن ہم اقتصادی زندگی کی مثال دیں گے۔ اس بارہ میں کم ہی اختلاف کیا جائے گا کہ گزشتہ صدی کے اسلامی جوش خروش کا ایک بڑا نتیجہ اسلامک بینکنگ اور فنانس ہے۔ وہی مسلمان جن کے درمیان دین داری اور تقویٰ ناپنے کا پیمانہ یہ تھا کہ وہ بینکوں سے کتنے دور رہتے ہیں، آگے بڑھ کر اسلامی بینک قائم کرتے نظر آئے! نصف صدی سے کم عرصہ میں دنیائے اسلام کے ہر گوشہ میں اسلامی مالیاتی اداروں کا ایک وسیع جال بچھ گیا جس سے علماء دین بحیثیت نگراں اور مشیر وابستہ ہوئے۔ ماضی کی بعض دینی سرگرمیوں کی طرح یہ مظہر کوئی علاقائی مظہر نہیں، نہ کسی غیر معمولی پر کشش لیڈر، مذہبی رہنما یا سماجی کارکن کی خصوصی دین ہے۔ اپنی نوعیت کا یہ ایک اچھوتا مظہر ہے۔ امید کی جانی چاہئے کہ مال و دولت سے تعلق ہونے کے سبب اس کا کچھ نہ کچھ اثر عدل و قسط کے اس تصور کو عملی جامہ پہنانے سے بھی ہو گا جس کا اسلام علمبردار ہے۔ جیسا کہ ہم کئی بار بتا چکے، انسانی احتیاجات کی تکمیل کے لئے پیداوارِ دولت میں اضافہ کے ساتھ، دولت اور آمدنی کی تقسیم میں ناہمواریاں کم کرنا، اسلام کے اہم مقاصد میں سے ہے۔ چنانچہ فنانس کے بارہ میں اسلامی ارشادات اور اصلاحات کے بھی یہی دو ہدف رہے ہیں: اعلیٰ کارکردگی اور عدل و قسط۔ اہم سوال یہ ہے کہ معاصر اسلامک بینکنگ اور فنانس نے ان دونوں مقاصد، بالخصوص مقصدِ عدل کی تحصیل میں کیا مدد کی اور اگر اس بارہ میں رکارڈ اچھا نہیں تو غلطی کہاں ہوئی؟

اس سوال کا جواب ہمیں دو الگ الگ حالات میں تلاش کرنا ہو گا۔ پہلے ان ملکوں کو لیجئے جنھوں نے حکومتی سطح پر اس فکر کو اپنایا، یعنی پاکستان، ایران اور سوڈان۔ اصل امید انہی سے وابسطہ کی جانی چاہئے کیوں کہ سماجی اور معاشی عدل کے قیام میں نجی دائرہ میں قائم ہونے والے مالیاتی ادارے حصہ تو لیتے ہیں لیکن فیصلہ کن نہیں ہو سکتے جب تک ان کی پشت پر ایک ایسی ریاست نہ ہو جو عدل و قسط کا صحیح تصور رکھتی ہو۔ مذکورہ بالا تین ریاستوں کے علاوہ، جو دستوری طور پر اسلامی نظام عدل کے قیام کی مکلّف ہیں، ملیشیا اور خلیج کی بعض ریاستوں نے بھی اسلامی مالیاتی نظام کو حکومتی سرپرستی دے رکھی ہے۔ پہلے ان ملکوں کا ریکارڈ دیکھا جانا چاہئے پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ جن ممالک میں نجی دائرہ میں اسلامی مالیاتی اداروں کی قابلِ ذکر تعداد کام کر رہی ہے ان کا کیا حال ہے۔

کارکردگی کا اندازہ شرحِ نمو سے کیا جا سکتا ہے۔ عدل و قسط کے لئے یہ دیکھنا ہو گا کی غربت کے ازالہ اور دولت و آمدنی کی تقسیم میں پائے جانے والے فرق میں کمی ہوئی یا نہیں۔ مذکورہ بالا ممالک میں سے اکثر کی شرحِ نمو حالیہ برسوں میں اچھی رہی مگر اس کی بنیاد پٹرول (ایران، سوڈان اور خلیجی ریاستیں) یا امریکی امداد (پاکستان) ہے۔ ملیشیا اچھی رفتار سے ترقی کر رہا ہے، مگر یہ امر تحقیق

طلب ہے کہ اس ترقی میں نظامِ زر و مالیات کو کتنا دخل ہے۔ غربت میں کمی ملیشیا اور خلیجی ریاستوں میں واقع ہوئی ہے مگر ان دونوں ممالک میں بھی دولت اور آمدنی کی تقسیم میں ناہمواری بڑھی ہے۔ ایران سوڈان اور پاکستان میں بھی دولت اور آمدنی کی تقسیم میں ناہمواری بڑھی ہے اور غالبًا غربت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

نجی دائرہ میں قائم ہونے والے اسلامی مالیاتی اداروں کے مقاصد شروع ہی سے محدود تھے۔ ان کا مشن یہ تھا کہ فنانس کے مروّجہ طریقوں کو حرام سے پاک کر کے اس قابل بنا دیا جائے کہ مسلمان انہیں استعمال کر سکیں۔ سود، قمار اور غررِ کثیر، یہ تین بڑی خرابیاں ہیں جو مروّجہ مالیاتی لین دین میں پائی جاتی ہیں۔ شریعہ اسکالرز کے تعاون سے اسلامی مالیاتی اداروں نے قدیم سے جاری اسلامی عقود پر مبنی ایسے بدل تلاش کر لئے جن کو اختیار کر کے مسلمان صنعت و تجارت میں آگے بڑھ سکتے تھے۔ یہ بڑا اچھا کام ہوا، مگر ظاہر ہے اس سے اسلامی عدل کا قیام عمل میں نہیں آ جائے گا۔ اس کام سے مسلمان اہل ثروت کو اپنی دولت کو مزید دولت کمانے کے جائز طریقے مل گئے۔ لیکن مسلمانانِ عالم کی تہی دست اکثریت کی جھولی میں ڈالنے کے لئے اسلامک بینکنگ اور فنانس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اسلامی اصول پر سرمایہ کاری کرنے والی کمپنیاں ایسے طریقے اختیار کرنے سے قاصر رہیں جن کے ذریعہ اصحابِ سرمایہ کے لئے نفع کمانے کے ساتھ کام کے لائق مگر کام میں لگانے کے لئے درکار سرمایہ سے محروم انسانوں کو کام پر لگایا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ تیس برسوں میں اسلامک بینکنگ اور فنانس کے نام پر جو کام ہوئے ان میں عدل و قسط کے قیام کو مقصود نہیں بنایا جا سکا۔ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا، گزشتہ نصف صدی کا اسلامی معاشیاتی لٹریچر عدل و قسط کی تلاش سے خالی ہے، الّا ماشاء اللہ۔ اس لٹریچر میں ترقی اور اس کی شرطوں پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے مگر قیام عدل کی شرطوں کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی۔ خاص طور پر ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ مطلوبہ عادلانہ معاشی نظام زر اور مالیات کے باب میں کیا جوہری تبدیلیاں چاہتا ہے۔ کہیں بازار کا دباؤ اور کہیں سرکار کا دباؤ، ہم کو آلیاتی mechanical تبدیلیاں کر کے مروّجہ طریقوں کو اسلامی بنانے پر مجبور کرتا رہا۔ لیکن اب یہ احساس عام ہو رہا ہے کہ اسلامی بینکنگ اور فنانس کو ایک نئی کروٹ لینے کی ضرورت ہے، جس میں روح کو قالب پر اور جوہر کو ظاہر پر فوقیت حاصل ہو۔ اس احساس کے پیچھے صرف یہی بات نہیں کہ نظامِ زر اور فنانس کو اسلامی تقاضا کے بموجب مقاصدِ شریعت سے مربوط کرنا ہنوز باقی ہے۔ اس کے پیچھے یہ تشخیص بھی ہے کہ مروّجہ سرمایہ دارانہ نظام زر و مالیات انسانی فلاح اور عالمی امن کے لئے خطرہ بن چکا ہے۔

یہ موقع اس کا نہیں کہ کوئی تفصیلی ایجنڈا پیش کیا جائے۔ اپنے عمومی موضوع، مقاصدِ شریعت، کی مناسبت سے یہ نوٹ کرنا کافی ہے کہ معاشی زندگی میں اسلام کو سرمایہ داری سے مختلف اور ممتاز بنانے والی چیز اخلاق ہے جس کی جڑیں توحید میں پیوستہ ہوں۔ اسلام نے انسان کو تمام تر مفادات و مصالح کی بنیادوں پر فیصلے کرنے کی بجائے اقتصادی امور میں فیصلے کرتے وقت بھی اخلاقی اقدار کو سامنے رکھنا سکھایا ہے۔ صارف ہو یا پیدا کنندہ، مل مالک ہو یا مزدور، ادھار لینے والا ہو یا ادھار دینے والا...... یہ سب اگر ہر موقع پر صرف اپنے نجی مفادات کی بڑھوتری چاہیں تو وہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے جسے دنیا سرمایہ داری کے نام سے آج بھگت رہی ہے۔ قومی سطح پر یہ رویہ قومی مفادات کی خاطر انسانی مصالح کی پامالی یا دوسری قوموں کے ساتھ دنیا کے خداداد وسائل میں برابر کے ساجھیوں جیسے سلوک کی جگہ ان کے استحصال اور اپنی چودھراہٹ جمانے کا رجحان پیدا کرتا ہے۔ یہ طریقے انسان جیسے سماجی وجود کو راس نہیں آتے۔ ذاتی نفع کی تکثیر profit maximization کا رویہ انسان کو اپنے بھائی انسان کے مفادات و مصالح کے بارہ میں لا پرواہ بلکہ بعض اوقات ان کو پامال کرنے والا بنا دیتا ہے۔ جب کہ سچائی، ایمان داری، انصاف، مساوات، ہمدردی جیسی اخلاقی قدریں انسان کو سکھاتی ہیں کہ اپنے مفاد کی تحصیل کے ساتھ دوسروں کے بھلے کا بھی خیال رکھیں۔ مفادات کے ساتھ اقدار کے حامل لوگ قومی سطح پر بھی دوسرے انسانوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کا تصورِ حیات انہیں سکھاتا ہے کہ جب بولیں سچ بولیں، جب تولیں ٹھیک تولیں، ادھار لیں تو ادا کرنے کی نیت سے لیں، نادار، کمزور اور لاچار کو اپنے مال میں سے کچھ دیں۔ دوسرے انسانوں کو اپنے اغراض کی تکمیل کے ذرائع سمجھنے کی بجائے انسانوں سے اچھے تعلقات رکھنے کو مقصود بالذات سمجھیں۔

اسلامی معاشیات کو شروع ہی سے اس بات کا شعور تھا کہ انسان کے صرف بندہِ مفادات و مصالح ہونے کا مفروضہ غلط ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ انسان اخلاقی اور روحانی اقدار سے بھی رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ کب، کس حد تک اور کیوں کر یہ سوالات تحقیقی جوابات چاہتے ہیں۔ قوتِ ارادی سے سرفراز، آزادیِ اختیار و انتخاب کے مالک انسان کے اقتصادی رویہ پر اخلاق و اقدار کے ا ثرات کے مطالعے کے لئے جو تاریخی، اور میدانی تحقیق درکار ہے اس کے اہتمام کی توقع چھائے ہوئے نیو کلاسیکی علمِ معاشیات سے نہیں کی جا سکتی۔ جدید علمِ معاشیات جس فضا میں پروان چڑھا ہے اس کے زیرِ اثر اس نے اخلاق و اقدار کو اپنے دائرۂ تحقیق سے باہر قرار دے رکھا ہے۔ اس غیرحقیقت پسندانہ موقف کی بدولت انسان کو بہت کچھ بھگتنا پڑا ہے۔ لیکن اب اس موقف سے بڑے بھاری

انفرادی اور قومی مفادات وابستہ ہیں ان کی گرفت سے اہل مغرب کو آزاد کرنے کی بنیادیں ہم کو باہر سے فراہم کرنا ہوں گی۔

اسلامی معاشیات کے لئے کرنے کا کام ان تصورات پر مبنی ایسے رویوں اور اداروں کی نقشہ کشی ہے جو ایک طرف تو اخلاق و روحانیت کی بنا پر اسلامی سند رکھتے ہوں دوسری طرف تاریخ اور معاصر زمینی حقائق ان کے عملی ہونے پر گواہ ہوں۔ یہ کام قیاس و استدلال سے زیادہ اختراع اور تجربیت creativity and empericism کا طالب ہے۔ گزشتہ صدی میں جو کام ہوا وہ زیادہ تر مسلمانوں کے لئے کیا گیا تھا۔ گزشتہ صدی کے وسط میں بہت سی مسلمان آبادیاں نوآبادیاتی استعمار سے باہر آ کر اس قابل ہوئیں کہ آزادی کے ساتھ اپنا معاشی نظام وضع کریں۔ اسلامی معاشیات والوں نے آگے بڑھ کر ایسے خطوطِ کار پیش کئے جن کی روشنی میں وہ اس وقت کی سرمایہ داری اور کمیونزم کی آویزش سے دوچار دنیا میں اپنا راستہ شریعت اسلامی کے مطابق نکال سکتی تھیں۔ آج اسلامی معاشیات کو سارے انسانوں کے لئے کام کرنا ہے۔ ایسا کرنا ایک طرف تو ہمارے اسلامی مشن کا تقاضا ہے اور دوسری طرف اس بات کا کہ اب دنیا اس طرح گھروندوں میں بٹی نہیں رہ گئی جیسے وہ سو سال پہلے تھی۔ اب مختلف قومی ریاستوں کے لئے اپنے الگ الگ نظامِ زر و مالیات کا قیام ممکن نہیں۔ گلوبلائزیشن کا مالیاتی لین دین اور نظامِ زر پر گہرا اثر پڑا ہے۔ دنیا ایک ہو رہی ہے۔ آج کے چیلنج کا تقاضا یہ ہے کہ اپنا گھر ٹھیک کرنا ہے تو پڑوس کی بھی فکر کی جائے، اپنی گلی صاف رکھنا ہو تو پورے محلّہ کا خیال رکھا جائے۔

اوپر عدل و قسط کے سیاق میں اسلامی معاشیات کی مثال، بات کو واضح کرنے کے لئے دی گئی ہے۔ مگر جائزہ لیجئے تو فکر و عمل کے سارے دائروں کا یہی حال ہے۔ سیاسی فکر اور حکمرانی کے طریقوں کے بارہ میں غالبًا اس سے زیادہ تشویش ظاہر کی جا سکتی ہے جتنی تشویش ہم نے معاصر معاشی فکر و عمل کے بارہ میں ظاہر کی ہے۔ مقاصد شریعت کی تحصیل میں ناکامی کا ریکارڈ سیاست میں زیادہ نمایاں ہے۔ معاشرت کی زبوں حالی اس لئے قابلِ افسوس ہے کہ اس میدان میں غالب تہذیب کی ناکامی سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ مسلمان اگر سچی اسلامی معاشرت کا ایسا نمونہ پیش کر سکتے جو دور جدید سے مناسبت رکھنے کے ساتھ سارے انسانوں، مرد، عورت، کالے، گورے، مغربی، مشرقی، شمالی، جنوبی...... سب کو اس طرح کی مساوات، حریت اور شرف dignity حاصل رہنے کی ضمانت دے سکتا جو خدائے واحد کی بندگی کا لازمہ ہے، تو آج اسلام کی تصویر وہ نہ بنتی جس نے پوری امت کو دفاعی پوزیشن میں ڈال رکھا ہے۔

تلافیِ مافات کی کوشش ضروری ہے اور اس کی بھی کہ آئندہ کے لئے سوچ سمجھ کر منصوبہ بنایا جائے۔ اس عمل کے آغاز میں حالیہ تجربوں کا تنقیدی جائزہ لینا بھی ضروری ہے اور آئندہ کے لئے ممکن طریقوں پر کھل کر گفتگو بھی۔ ظاہر ہے یہ نہ تو کوئی سب کے لیے خوش کن کام ہے نہ ایسا جس کے نتائج پر سب کا اتفاق ممکن ہو۔ لیکن زندگی کی اسلامی تعمیرِ نو کے کام میں اسلامی صفوں کے درمیان مقاصدِشریعت کے فہم وتطبیق کے عمل میں اختلافات کو جاننا اور ان پر تبادلۂ رائے کرنا ہماری ایک بڑی ضرورت ہے۔ جملہ مقالات میں ہماری کوشش رہی ہے کہ اس غور وفکر اور تبادلہ رائے میں حصہ لیں، اور مقالات پڑھنے والوں کو بھی اس عمل میں حصہ لینے پر آمادہ کریں۔ وباللہ التوفیق!

حواشی و حوالہ جات

۱۔ مقاصدِ شریعت، ایک عصری مطالعہ۔ اپریل-جون ۲۰۰۴ء
مقاصدِ شریعت اور معاصر اسلامی فکر، وقائع اور امکانات۔ اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۵ء
مقاصدِ شریعت کی پہچان اور تطبیق میں عقل و فطرت کا حصہ۔ جنوری-مارچ ۲۰۰۶ء
مقاصدِ شریعت کے فہم وتطبیق میں اختلاف کا حل۔ جنوری-مارچ ۲۰۰۷ء
مقاصدِ شریعت کی روشنی میں اجتہاد کی حالیہ کوششیں۔ اپریل-جون ۲۰۰۷ء
مقاصدِ شریعت کی روشنی میں معاصر اسلامی فنانس کا جائزہ۔ جولائی-ستمبر۲۰۰۷ء
مقاصدِ شریعت اور مستقبل انسانیت۔ اکتوبر- دسمبر ۲۰۰۷ء

۲۔ مقاصد شریعت اور معاصر اسلامی فکر، وقائع اور امکانات۔ اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۵ء

۳۔ مقاصدِ شریعت اور مستقبلِ انسانیت، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۷ء

۴۔ مقاصدِ شریعت کی پہچان اور تطبیق میں عقل و فطرت کا حصہ۔ جنوری-مارچ ۶۰۰۲

۵۔ القرآن ۱:۶۹

۶۔ القرآن ۴۶:۳۴

۷۔ القرآن ۲۹:۳۸

۸۔ القرآن ۲۰:۴۵

۹۔ القرآن، ۴۴:۱۶

۱۰۔ القرآن، ۹۸:۶

۱۱۔ القرآن، ۱۸۵:۷

۱۲۔ القرآن ۲: ۱۲۱

۱۳۔ القرآن، ۲۲۲:۲

۱۴۔ مسلم، صحیح، حدیث نمبر۲۹۴۵۔ کتاب الذکر، باب فضل الاجتماع علیٰ تلاوۃ القرآن و علی الذکر

۱۵۔ مولانا عمیدالزمان قاسمی کیرانوی، شاہ ولی اللہ کی تجدیدی خدمات: چند پہلو، صفحہ ۶۹۔ امام شاہ ولی اللہ اور ان کے

افکار و نظریات، مرتبہ مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی، شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء

۱۶۔ تفصیلات کے لیئے ملاحظہ ہو:

Penguin Akbar Ahmed (2007) Journey into Islam,The Crisis of Globalization, pages 99-101 & 108 India,

۱۷۔ مقالہ 'مقاصدِ شریعت کی روشنی میں اسلامی فنانس کا جائزہ' کا آ خری حصہ

۱۸۔ Mohammad Nejatullah Siddiqi, Economics of Tawarruq, paper presented on 1 February, 2007, at London School of Economics in a workshop on Tawarruq. Reproduced in Business Islamica, Dubai, June 2007

۱۹۔ القرآن، ۳:۱۱۰

۲۰۔ Sherman A. Jackson (1996), Islamic Law and the State: The Constitutional Jurisprudence of Shihab al Din al Qarafi (626/1228 682/1283) Kitab al Ihkam fi Tamyiz al Fatwa an al Ahkam wa Tasarrufat al Qadi wa al Imam. E.J Brill, Leiden, New York, Koln. خاص طور پر صفحات ۵۱۲؛ ۲۸ اور مترجم کے مقدّمہ کا صفحہ ۳۰۔

۲۱۔ مسلم، صحیح، حدیث نمبر ۱۰۱۷۔ کتاب الزکاۃ، باب الحثّ علی الصدقہ

۲۲۔ بعض تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو جناب سیّد صدیق حسن صاحب مرحوم، جمع و تدوینِ قرآن، اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۹۸۷ء۔

۲۳۔ بعض تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو، علوم الحدیث، مصنفہ ڈاکٹر صبحی صالح، مترجمہ غلام احمد حریری۔ نئی دہلی، اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۲۔